جمعیت علمائے اسلام: مفتی محمود کے کردار کا تنقیدی مطالعہ

Jamiat-e-Ulema-e-Islam: An Analytical Study of the Role of Mufti Mahmood

ڈاکٹر خالد محمود[i] ڈاکٹر محمد عابد[ii]

Abstrct

Jamiat-e-Ulema-e-Islam is considered the most active religious-political party in the practical politics of Pakistan. Mufti Mahmood was the most brilliant ameer (Leader) of this party without any doubt. Jamiat-e-Ulema-e-Islam has passed through a number of progressive steps under his leadership. The party decided to take part in politics under the guidance of Mufti Mahmood. However, it was very difficult for an Islamic Religious Party to not only accept the western democratic system but also taking part in the politics. Under the directictions of Mufti Mahmood, the party first came out in support of Ayub Khan's dictatorship but then rallied against him. It was Mufti Mahmood who fully participated in the Pakistan National Allience against Bhutto and later supported General Zia-ul-Haq. It can be said that today Jamiat Ulema-e-Islam stands with the image of a religious political party with its strong political foundations. This image is derived from the thoughts and philosophy of its former Ameer Mufti Mahmood.

Keywords: Religious, Politics, Mufti Mahmood, Martial Law, Freedom, Convention, Ulema.

جمعیت علمائے اسلام سنی دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والوں کی ایک دینی وسیاسی جماعت ہے، جو بنیادی طور پر جمعیت علمائے ہند کی ایک شاخ ہے جس کی نظریاتی اساس شاہ ولی اللہ کے فکر وفلسفہ سے جلا پا کر بنی تھی۔اس کا قیام 1945ء میں اُس وقت عمل میں آیا تھا جب مسلم لیگ کی طرف سے پاکستان کے مطالبے کی حمایت اور مخالفت میں جمعیت علمائے ہند کے علماء دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ اسی اختلاف کے سبب پاکستان کی حمایت کرنے والے علماء جن کی قیادت مولانا شبیر احمد عثمانی کر رہے تھے، نے جمعیت علمائے ہند سے علیٰحدہ ہو کر اپنی علیٰحدہ جماعت بنائی جس کا نام جمعیت علمائے اسلام رکھا گیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کی سربراہی میں متحد ہونے والے علماء کے اس گروپ کو مولانا کے انتقال کے تین برس بعد 1925ء میں سیاسی ضروریات کے تحت جمعیت علمائے اسلام پاکستان کا نام دے دیا گیا۔ تاریخی اعتبار سے جمعیت علمائے اسلام پاکستان کا پاکستان کی سیاست میں نمایاں کردار نظر آتا ہے۔ قیام پاکستان سے جنرل ایوب کے دور تک یہ جماعت ایک

i لیکچرار، ڈیپارٹمنٹ آف پاکستان سٹڈیز، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ii ایسوسی ایٹ پروفیسر، لیاقت گورنمنٹ کالج فار بوائز ملیر، کراچی

پریشر گروپ کے طور پر کام کرتی رہی۔ انتخابی سیاست میں اس جماعت نے جنرل ایوب کے دور میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات سے حصہ لیناشروع کیا تھا، جس میں مفتی محمود بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت انتخابات جیت کر ایوب کی اسمبلی کے رکن بنے۔ اُس وقت سے پاکستان کی پارلیمانی سیاست میں بھی اس جماعت کا متحرک اور قابل ذکر کردار نظر آتا ہے[1]۔ جمعیت علمائے اسلام (پاکستان) کا پاکستان کی سیاست میں کردار کے صحیح ادراک کے لیے جمعیت علمائے ہند کے قیام کے تاریخی پس منظر اور تقسیم سے قبل ہندوستان کے تیزی سے بدلتے سیاسی حالات میں جمعیت کی تبدیل ہوتی ہوئی حکمت عملیوں کو سمجھنا ضروری ہوگا۔

پس منظر

ہندوستان میں سیاسی معاملات میں علماء کی باقاعدہ دلچسپی یا شمولیت یقینی طور پر مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دور میں اُس وقت سے شروع ہوئی جب شیخ احمد سرہندی نے اکبری دربار میں بعض رسومات کو غیر اسلامی قرار دے کر اُنہیں ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ بہت ممکن تھا اکبر اور شیخ صاحب کے درمیان شروع ہونے والا یہ قضیہ کوئی سنجیدہ صورت اختیار کر لیتا لیکن اکبر کے دُنیا سے گزر جانے سے یہ معاملہ کچھ عرصہ کے لئے پیش منظر سے ہٹ گیا اور دوبارہ شہنشاہ جہانگیر کے دور میں اُس وقت اہمیت اختیار کر گیا جب جہانگیر نے شیخ صاحب کو دربار میں بُلایا اور آداب شاہی بجانہ لانے پر سزا کے طور پر اُنہیں دو برسوں کے لئے گوالیار کی جیل میں قید کر دیا گیا۔ تاہم غلط فہمی کا تدارک ہونے پر جہانگیر نے نہ صرف شیخ صاحب کو رہا کیا بلکہ اُن کے کہنے پر دربار سے سجدۂ تعظیمی جیسی متعدد ایسی رسومات کو ختم بھی کر دیا جو غیر اسلامی سمجھی جارہی تھیں۔ ہندوستان میں یہ پہلا موقع تھا کہ جب علماء کی جانب سے طاقتور حکمرانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ معاملات حکومت کو اسلام کے اُصولوں کے مطابق چلائیں۔ شیخ صاحب کی تمام تر کاوشوں کا بنیادی مقصد اصلاح معاشرہ اور اصلاح حکومت تھا[2]۔

شاہ ولی اللہ کی فکر و فلسفے کے احیاء سے مدرسہ دیوبند کے قیام تک

اگرچہ فقہی، فکری اور مسلکی حوالے سے شاہ ولی اللہ شیخ احمد سرہندی ہی کے ہم قبیل اور ہم قافلہ تھے، لیکن شاہ صاحب کو درپیش حالات یکسر مختلف اور زیادہ پُر آشوب تھے۔ شیخ صاحب کے زمانے میں اولین مسئلہ مسلم معاشرت اور مسلم دربار کو تیزی سے پھیلتی غیر اسلامی رسومات سے بچانا تھا، یعنی وہاں مسلم اقتدار کو کوئی خطرہ لاحق نہ تھا، جبکہ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں مسلمانوں کا اقتدار، دین، معاشرت، سیاست اور معیشت سب ہی تباہی سے دوچار تھے۔ شاہ صاحب نے اپنے تئیں علمی اور عملی دونوں ہی سطحوں پر ان مسائل سے مسلمانوں کو نکالنے کی ایک توانا کوشش کی۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی تحریروں میں ہندوستان کے لیے ایک ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت پر زور دیا تھا، تاہم بقول مصنف یہ انقلابی سوچ شاہ صاحب کے قائم کردہ علمی حلقوں اور قلمی کتابوں سے لے کر ایک محدود دائرے تک ہی پھیل سکی اور عوام الناس تک اس سوچ اور فکر کی رسائی نہ ہو سکی، اس لیے دُنیا ایک عظیم مفکر کی انقلابی سوچ کی برکات سے محروم رہی[3]۔

1763 ء میں شاہ صاحب اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے نامکمل مشن کو اُن کے بیٹوں نے آگے بڑھانے کی کوشش کی، جن میں نمایاں طور پر شاہ عبدالعزیز تھے۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی حالات پہلے سے زیادہ دگرگوں ہوتے جارہے تھے۔ اگرچہ شاہ صاحب کی زندگی ہی میں جنگ پلاسی (1757ء) میں نواب سراج الدولہ کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست اور بنگال پر قبضہ سے ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کا آغاز ہو چکا تھا، تاہم ٹیپو سلطان (نواب میسور) کی شہادت (1799ء) کے بعد انگریزی استعمار نے تیزی سے اپنے بازو پھیلانے شروع کیے۔ گویا اب سکھوں اور مرہٹوں کے علاوہ انگریز بھی ہندوستان کی زمین سے اپنی طاقت اور ترقی کا خراج وصول کر رہے تھے۔ 1803ء میں لارڈ لیک نے دہلی پر حملہ کیا اور مغلوں کے محافظوں یعنی مرہٹوں کو شکست دے کر مغل بادشاہ شاہ عالم سے ایک ایسا معاہدہ کیا جس نے عملاً مغلوں کو محض کٹھ پتلی حکمران بنا دیا تھا۔ اس سارے منظر نامے میں علماء ہند کسی طور بھی ہندوستان میں مسلمانوں کو درپیش مسائل سے خود کو دور نہیں رکھ سکتے تھے[4]۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام سے جمعیت علمائے ہند کی تشکیل تک

شاہ ولی اللہ کی شروع کی ہوئی تحریک ہندوستان میں مسلم قوم کے دینی، سماجی اور اخلاقی احیاء اور اصلاح سے شروع ہو کر جہاد فی سبیل اللہ کی صورت میں مسلح جدوجہد اور پھر جمعیت علمائے ہند جیسی سیاسی تحریک میں بدلنے تک جن نشیب و فراز سے گزری اُسے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے چھ مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اس سفر کا پہلا مرحلہ تو وہی تھا جو خود شاہ ولی اللہ نے شروع کیا تھا جو مسلم قوم کی دینی، سماجی اور اخلاقی بہتری کے لیے کی گئی کاوشوں پر مشتمل تھا، تاہم ان کوششوں میں مسلم اقتدار کی بحالی کے لئے مسلح جدوجہد کی جانب توجہ اُس وقت مبذول ہوئی جب شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نیا ٹھارویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے تیزی سے بدلتے حالات اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیش نظر ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے جہاد کا فتویٰ جاری کیا تھا[5]۔

شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کے بعد سے علماء کی جدوجہد میں عملاً مسلح جہد وجہد کا عنصر شامل ہو گیا۔ اور سکھوں سے لے کر انگریزوں کے خلاف کئی مسلح تحاریک کا سبب بنا۔ شاہ صاحب کی تحریروں سے ہدایت لے کر اُن کے جانشین مسلسل رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جہاں مسلمانوں کو غیر اسلامی رسومات سے باز رہنے اور اسلامی شعائر اختیار کرنے کی تلقین جاری تھی وہیں شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کی کاپیاں تقسیم کر کے آمادہ ئ جہاد بھی کیا جارہا تھا[6]۔

اس فتوے کے نتیجے میں شروع ہونے والی پہلی باقاعدہ مسلح کوشش، تحریک مجاہدین یا تحریک جہاد تھی جسے علما کی جانب سے ہندوستان کی سیاست میں شرکت یا دلچسپی کا دوسرا مرحلہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ تحریک سید احمد شہید اور شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہید نے شروع کی تھی۔ واضح رہے کہ اُنیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں پنجاب کے سکھ

حکمرانوں کے خلاف شروع کی جانے والی اس جدوجہد کو بھی مہمیز شاہ ولی اللہ کے افکار سے ہی حاصل ہوئی تھی۔ اس تحریک کا اختتام 1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں کے ساتھ ایک جنگ میں متذکرہ بالا دونوں صاحبان کی شہادت پر ہوا۔

تیسرے مرحلے میں 1857ء میں شمالی ہند میں شروع کی جانے والی انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد تھی جسے جنگ آزادی کہا گیا جو سب سے زیادہ پُرزور اور متاثر کن مرحلہ ثابت ہوئی۔ اگرچہ یہ جنگ براہ راست علماء کرام نے شروع نہیں کی تھی مگر ہنگامہ برپا ہوتے ہی علماء کی بڑی تعداد بڑی سرعت سے اس میں شامل ہوتی چلی گئی۔ فکری اور مسلکی لحاظ سے جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے اُن علماء کی اکثریت شاہ ولی اللہ کے پیروکاروں پر مشتمل تھی۔

چوتھا مرحلہ وہ تھا جب جنگِ آزادی 1857ء میں ناکامی کے بعد 13 مئی 1866ء کو مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور اُن کے کچھ رفقاء نے اُتر پردیش کے شہر سہارن پور کے ایک مقام 'دیوبند' میں ایک مدرسے کی بنیاد رکھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ علماء کرام نے مسلح جدوجہد کو ترک کر کے اور گمنامی میں جانے کے بجائے ایک مقام کو مستقل مرکز بنا کر اپنی جدوجہد کو اسلامی ثقافت کی بقا اور مسلم بچوں اور نوجوانوں کو اسلام کی تعلیمات دینے کی طرف مبذول کر دیا تھا۔ بغاوت کے الزام کی زد میں رہنے والے علما کا ایک مدرسہ قائم کر کے ایک مقام پر ٹھہر جانا یقینی طور پر کچھ سوالات کو جنم دیتا ہے۔ پہلا یہ کہ جب انگریز جنگ میں حصہ لینے والوں کو سخت سزائیں دے رہا تھا اور کسی کے لیے کوئی معافی کا تصور بھی نہیں تھا تو جنگ میں عملی حصہ لینے والے درج بالا دونوں صاحبان کیونکر انگریزوں کے انتقام سے بچے رہے اور دوسرا سوال یہ کہ انگریز نے کس طرح ان علماء کی جانب سے ایک مدرسے کے قیام کو قبول کیا؟ پہلے سوال کے جواب میں تو ایک مصنف کچھ اس طرح لکھتے ہیں :

> "مولانا قاسم نانوتوی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے مگر آپ روپوش ہو گئے اور بعض سفارشوں کی وجہ سے وارنٹ گرفتاری واپس ہو گئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی چھ مہینے گرفتار رہ کر آخر رہا ہو گئے، چونکہ اُس وقت ان کی اتنی شہرت نہ تھی[7]۔"

آگے چل کر مصنف یہ بھی لکھتا ہے:

> "اگرچہ ان دونوں حضرات نے تحریک میں پورا پورا حصہ لیا تھا لیکن خدا کی غیبی امداد سے دونوں بال بال بچ گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک بہت بڑا کام لینا تھا۔ جبکہ دوسرا سوال کہ انگریز کے لیے ان علماء کی جانب سے ایک مدرسہ کا قیام کس طرح قابل قبول تھا تو اس کی ایک ہی وجہ سمجھ آتی ہے کہ یہ انگریزوں کی پالیسی کا حصہ تھا وہ جانتے تھے کہ دربدر پھرتے اور روپوشی گزارنے پر مجبور علماء کہیں نہ کہیں متحد ہو کر پھر سے مسائل کھڑے کر سکتے ہیں لہذا اُنہیں ایک مرکز بنانے کی اجازت دینے میں یہ فائدہ تھا کہ اس طرح ان علماء اور اُن کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا ممکن ہو گیا تھا۔ لیکن باوجود اس مستقل بندوبست کے کچھ علماء کرام نے 1912ء میں ایک بار پھر انگریز سامراج کے خلاف ایک مسلح جدوجہد کی کوشش کی جسے تاریخ تحریک ریشمی رومال کے نام سے یاد کرتی ہے، جس کی قیادت مولانا محمود الحسن نے کی تھی۔ اسے ہم علماء کرام کی کاوشوں کا پانچواں مرحلہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ تحریک ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزاد کرانے کی ایک مسلح جدوجہد کی منصوبہ بندی پر مشتمل تھی۔ منصوبہ کے مطابق ہندوستان کی آزادی کے خواہش مند گروپوں جس میں کچھ کانگریسی رہنما جیسے کہ گاندھی جی، موتی لعل نہرو اور مہندر پرتاب بھی شامل تھے

اور دوسری طرف علماء دیوبند کی بڑی تعداد شامل تھی جو دراصل اس منصوبہ بندی کے اصل محرک تھے۔ منصوبہ کچھ اس طرح تھا کہ ایک طے شدہ تاریخ جو کہ 19 فروری 1915ء مقرر کی گئی تھی کو ترکی، افغانستان اور جرمنی کے تعاون سے آزادی کے حصول کے خواہش مندوں نے ہندوستان پر حملہ کرنا تھا اور عین اُس وقت ملک کے طول و عرض میں قائم تحریک کے مراکز کو انگریز حکومت کے خلاف بغاوت کرنا تھی اور اس طرح انگریزی حکومت کو ہندوستان سے دھکیل دیا جاتا اور ہندوستان ایک کامل آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ تحریک کے اہم علماء کی تحریروں سے دُنیا بھر میں اس تحریک کے ہندوستان کے علاوہ پانچ مراکز کا ذکر ملتا ہے جو کہ مدینہ منورہ، کابل، برلن، قسطنطنیہ اور انقرہ میں قائم تھے۔ تاہم افغانستان کے شہر کابل میں قائم مرکز در حقیقت اس تحریک کا اصل ہیڈ کوارٹر تھا[8]۔"

لیکن بعض اہم وجوہات کی بناپر جن میں سے ایک اپنوں کی بے وفائی یا غداری بھی شامل تھی یہ تحریک ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ ایک مایہ ناز عالم دین کے مطابق تحریک کی ناکامی کی ایک وجہ مولانا محمود الحسن کا ہر ایک پر حد سے زیادہ اعتماد کر لینا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ الہند بانی تحریک حُسن اعتماد میں بہت بڑھے ہوئے تھے اور بعض ایسے افراد کو اپنا مشیر کار بنایا ہوا تھا جو کہ اندرونی طور پر انگریز کے جاسوس تھے اور ظاہری طور پر حضرت شیخ کے معتقد اور فدائی بنے ہوئے تھے۔ یہ لوگ پوری کاروائیوں سے انگریز کو مطلع کر رہے تھے۔ چونکہ مسلمان قوم میں قومی وفاداری کا جذبہ قومیت ختم ہو چکا تھا، اس لیے انگریز کو ایسے افراد مسلمان قوم میں کافی مل گئے۔ اس کے برعکس ہندو قوم کے کسی ایک فرد کے متعلق بھی آج تک اس تحریک میں جاسوسی کرنے کا شبہ تک نہیں کیا[9]۔"

اس ناکامی اور اس کے نتیجے میں دیگر باغیوں کی طرح مولانا محمود الحسن بھی انگریزوں کے عتاب سے گزرے۔ اُنہیں قید سخت کی سزا سُنائی گئی اور اُنہیں مالٹا لے جا کر پابند سلاسل کر دیا گیا۔ اسی حوالے سے مولانا کو 'اسیر مالٹا' کا لقب بھی ملا۔ مولانا محمود الحسن نے لگ بھگ ساڑھے تین سال قید میں گزارے اُن کے ساتھ اُن کے چار شاگرد بھی قید تھے جن میں مولانا حسین احمد مدنی بھی شامل تھے۔ ان صعوبتوں سے گزرنے کے بعد جب مولانا محمود الحسن کو قید سے رہائی ملی اور آپ واپس ہندوستان پہنچے تو آپ نے 1919ء میں اس تحریک کو ایک دوسرا رُخ دے دیا جو مسلح جدوجہد کی بجائے عدم تشدد کی پالیسی اور ہندو مسلم اشتراک پر مبنی تھا اور جو حصول آزادی کی ایک سیاسی جدوجہد پر مشتمل تحریک میں تبدیل ہوا[10]۔ اسے ہم علماء کی جانب سے جدوجہد کا چھٹا مرحلہ کہہ سکتے ہیں۔ دراصل یہی وہ اہم مرحلہ تھا جب مولانا محمود الحسن نے علمائے ہند میں ربط اور باہمی تعلق کو مضبوط کرنے اور ان کے درمیان ایک اداراتی رشتہ قائم کرنے کے لئے جمعیت علمائے ہند کی بنیاد رکھی۔ بلاشبہ جمعیت علمائے ہند کے قیام میں مدرسہ دیوبند اور علمائے دیوبند ہی کا کردار تھا۔ جمعیت علمائے ہند کی تنظیم سازی انگریزی حکومت کے لیے اس لیے قابل قبول تھی کہ یہ اُس دائرہ کار کے مطابق تھی جس کی اجازت انگریز حکومت نے دے رکھی تھی۔ جمعیت علمائے ہند کے قیام سے متعلق ایک محقق کچھ اس طرح سے رقم طراز ہیں:

"22 نومبر 1919ء کو جب دہلی میں خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ اتحادیوں سے عموماً اور حکومت برطانیہ سے خصوصاً ان وعدوں کے ایفا کا مطالبہ کیا جائے جو مسلمانوں سے جنگ عمومی کے وقت کیے گئے تھے تو خلافت کے اس جلسہ میں علماء نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ انہیں ایک رابطہ میں منسلک کیا جائے جن کی اجتماعی قوت کو 1857ء کے انقلاب نے بالکل منتشر کر دیا تھا[11]۔"

جمعیت علمائے ہند کے سیاسی موقف میں حالات کے مطابق ہوتی تبدیلی

جمعیت علمائے ہند کے پہلے امیر مولانا محمود الحسن بنے اور اس کا مرکز دہلی کو بنایا گیا۔ جمعیت کا قیام باقاعدہ طور پر ہندوستان کی سیاست میں علمائے کرام کی شرکت کا نکتہ عروج تھا۔ تاہم جمعیت کا سیاسی نکتہ نظر 20ویں صدی کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں ہندوستان کی مسلم قوم کی اکثریت کی سوچ کا آئینہ دار نہ تھا۔ جمعیت علمائے ہند سے تعلق رکھنے والے علماء کی اکثریت متحدہ ہندوستان اور متحدہ ہندوستانی قومیت کی حامی اور دو قومی نظریہ کی مخالف تھی اور اسی لحاظ سے یہ ہندوستان کے لیے کامل آزادی کے خواہاں تھے اور تقسیم ہند کی مخالفت کرتے تھے اور اس کے لیے سیاسی طور پر کانگریس کے ساتھ مل کر مشترکہ جدوجہد کر رہے تھے۔ 1919ء میں جمعیت علمائے ہند کے قیام سے 1946ء تک کے اجلاسوں میں پیش کی جانے والی تجاویز اور سفارشات کی روشنی میں نہ صرف جمعیت کے سیاسی نکتۂ نظر یا فلسفہ کو بلکہ جمعیت کے ہندوستان کے حوالے سے بتدریج بدلتے موقف کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ابتداء میں جمعیت کا موقف ہندوستان پر صرف مسلمانوں کے حق حکمرانی کا دعویدار تھا۔ اس سلسلے میں 14 مارچ 1926ء کو مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں ہونے والے جمعیت کے ساتویں سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ میں پیش کردہ تجاویز کا حوالہ اس موقف کی تائید میں دیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ یوں تھیں:

تجویز نمبر 11/13

جمعیت علماء ہند کا یہ اجلاس اس لحاظ سے کہ ہندوستان کو غیر ملکی حکومت سے آزاد کرانا، اور اس کے حصول میں تمام مناسب اور جائز ذرائع کو استعمال کرنا تمام باشندگان ہند کا قومی اور وطنی فریضہ ہے اور بالخصوص مسلمانوں کا تو مذہبی نصب العین بھی ہے۔ جیسا کہ جمعیت علماء ہند متعدد بار اپنی سابقہ دستاویزوں میں اس پر کافی روشنی ڈال چکی ہے، طے کرتا ہے :

"اگرچہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جملہ باشندگان ہند کا اتحاد عمل اور باہمی رواداری اور اعتماد ضروری ہے۔ مگر بدقسمتی سے برادران وطن کے بعض ممتاز لیڈروں نے دانستہ یا نادانستہ غلط رویہ کی وجہ سے ایسا طرز عمل اختیار کیا ہے جس سے نہ صرف باہمی شقاق و منافرت کی خلیج بہت زیادہ وسیع ہو گئی اور ہوتی جا رہی ہے بلکہ آزادی وطن میں بھی روزانہ مشکلات کی کڑیوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اور غیر ملکی حکومت کی قوت میں استحکام اور باشندگان ہند کی طاقت میں ضعف و اضمحلال بڑھتا جا رہا ہے۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم اور واجب ہو گیا ہے کہ وہ مسلم قوم کی منتشر قوتوں کو مجتمع کریں اور خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور آزادی وطن کی مساعی میں دوسروں کا منہ تکے بغیر سرگرم ہو جائیں۔ اور بالخصوص اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ صدیوں تک

ہندوستان اسلامی ممالک میں داخل رہا ہے اور غیر ملکی حکومت نے مسلمانوں ہی سے چھینا ہے اس لیے اس کی آزادی کا فریضہ بھی براہ راست مسلمانوں پر اولاً و بالذات عائد ہوتا ہے[12]۔"

واضح رہے کہ ہندوستان کو آزادی دلانے کا فریضہ مسلمانوں پر ڈالنا اور یہ کہنا کہ صرف مسلمان ہی ہندوستان کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرانے کے ذمہ دار ہیں اور یہ بھی یاد دہانی کرانا کہ ہندوستان طویل عرصہ تک اسلامی ممالک میں شامل رہا ہے اور یہ بھی کہ انگریز نے ہندوستان مسلمانوں ہی سے چھینا تھا اور مسلمان ہی اسے آزادی دلائیں گے، کالا محالہ مطلب و مقصود یہ ہی نکالا جاسکتا ہے کہ جب ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزادی مسلمان دلائیں گے تو پھر وہی بجا طور پر ہندوستان پر حق حکمرانی بھی رکھیں گے۔ یہ تھا جمعیت علمائے ہند کا ہندوستان پر مسلمانوں کے حق کے حوالے سے ابتدائی موقف۔ اسی کے ساتھ جمعیت سیاسی اعتبار سے کس طرح آگے بڑھ رہی تھی اور اُس کی سوچ و فکر میں سیاست میں حصہ لینے کے سوال اور طریقۂ کار کے حوالے سے جو ابہام تھے وہ رفتہ رفتہ کس طرح دور ہو رہے تھے اس کا اندازہ بھی ہمیں جمعیت کے ایک جلسہ میں تجویز کی گئی عملی کاروائیوں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر:

- یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ مسلم قوم عموماً اور علمائے کرام خصوصاً سیاسی امور میں غور و خوض کیا کریں (کیونکہ سیاست مذہب سے اسلام میں علیٰحدہ چیز نہیں ہے) اور تمام قوم میں سیاسی امور کی تبلیغ کرتے ہوئے قوم کو بیدار اور اپنے حقوق کے پہچاننے کا طالب و ساعی بنادیں۔
- آزادیِ ہند کے فریضہ ہونے کی مذہبی، مالی، ملکی، انسانی وجوہ و اسباب کو نہایت غور و خوض سے دریافت کریں اور لوگوں کو سمجھائیں، دیگر مذہبی امور کی اشاعت کی طرح اس کو بھی ضروری سمجھیں۔ غلامی اور حقوق کے مسلوب ہونے کے مضار مفاسد کی اشاعت نہایت پُرامن طریقہ سے کر کے ہر مسلمان کو زندہ کریں۔
- یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ قومی اخبارات و رسائل جن میں باشندگان ہند کے حقوق اور آزادی پر روشنی ڈالی جاتی ہے کا ہمیشہ مطالعہ کیا کریں اور ایسے رسائل و مضامین لکھ کر عام پبلک میں شائع کر دیں اور مواعظ میں قوم کو ان امور پر خاص طور پر متوجہ کیا کریں۔
- یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ چونکہ اہل ہند کے بے انتہا افلاس کے دور کرنے کا پُرامن اور مہتم بالشان طریقہ یہ ہے کہ چرخوں کے سوت اور کھدر کو رواج دیا جائے اور عام طور پر غیر ملکی چیزیں نہ خریدیں[13]۔

علماء کرام اور اپنے لوگوں کو عملی سیاست میں حصہ لینے کے لیے جو رہنمائی فراہم کی جارہی ہے ان میں واضح طور دیکھا جاسکتا ہے کہ نہ صرف اُنہیں سیاسی امور پر غور و خوض کرنے کا مشورہ دیا جارہا ہے بلکہ عملی طور پر حصہ لینے کی تلقین اس دلیل کے ساتھ کی جارہی ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست الگ الگ نہیں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ بات قوم کو سمجھانے کی ضرورت پر بھی زور دیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانیوں کی حقوق اور آزادی کے موضوعات پر اخبارات میں شائع ہونے والی تحریروں کو نہ صرف پڑھنے بلکہ ایسی تحریریں لکھنے کے لیے حوصلہ افزائی بھی کی جارہی ہے۔ نیز ہندوستان کی معیشت کی

بہتری کے لیے دیسی اشیاء کے استعمال پر بھی زور دیا جارہا ہے۔ غرض جمعیت علمائے ہند کا سفر بتدریج ایک سیاسی جماعت کی منزل کی جانب گامزن دکھائی دیتا ہے۔

1920ء کی دہائی میں جب ہندوستان میں نئے آئین کے حوالے سے بحث زوروں پر تھی اور کانگریس کی طرف سے قائم کردہ نہرو کمیٹی نے جو رپورٹ شائع کی تھی جمعیت کی طرف سے اُس رپورٹ پر کی گئی تنقید دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ جمعیت کے ذرائع کے مطابق یہ تنقید دسمبر 1928ء میں اخبارات میں شائع کی گئی تھی۔

- سفارشات پر بحث کرنے سے پہلے ہم یہ ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ جمعیت علمائے ہند کا مطمعِ نظر اور نصب العین مکمل آزادی ہے اور اس کے نمایندے اس نصب العین کے خلاف کسی تجویز یا قاعدہ یا دفعہ کی تصدیق و تائید نہیں کر سکتے
- دوسرے یہ کہ ہندوستان میں ایسی حکومت کا قیام جس کی باگ ہندوستان کے ہاتھ میں ہو اور جس کے ماتحت تمام مذاہب اور اقوام کے حقوق محفوظ ہوں۔ جمعیت کے نزدیک لازمی اور ضروری ہے کہ وہ ہر اس سعی کا نہ صرف خیر مقدم کرنے بلکہ اس میں شریک ہونے کو تیار رہے جو ایسی حکومت کے حصول کے لیے ضروری یا مفید ہو۔
- ہم آزادی کے دستور اساسی کے مخالف نہیں ہیں مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اس میں ایسی ضمانتیں شامل کر دی جائیں جن سے حفاظت کا یقین حاصل ہو جائے۔ جمعیت علماء مسلمانوں کے لیے کوئی ناواجب اور غیر منصفانہ رعایتیں نہیں مانگتی۔ وہ صرف یہی چاہتی ہے کہ بروئے قانون، عقل و انصاف مسلمان جتنے حصہ کے حق دار ہیں وہ ان کو دیا جائے اور اس کی حفاظت کا اطمینان ہو جائے[14]۔

نہرو رپورٹ پر کی گئی درج بالا تنقید سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جوں جوں جمعیت کے رہنما پیش آنے والے واقعات میں دلچسپی لیتے گئے اُنہیں اس حقیقت کا ادراک ہو چلا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے مقابلے میں ایک اقلیت ہیں، ایک ایسی اقلیت جو ہندوستان کی کل آبادی کا محض ایک چوتھائی ہے۔ اور جو نظام حکومت یعنی جمہوریت انگریز نے گزشتہ ایک صدی میں رفتہ رفتہ یہاں نافذ کیا ہے، اُس میں ہندوؤں نے اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ اس نظام میں اُن کے لیے کھونے کو کچھ نہیں ہے اور وہ یقینی طور پر اپنی عددی برتری کی اہمیت سے واقف ہو چکے تھے۔ لہذا وہ اب کبھی بھی ماضی کی طرح اقلیت کی اکثریت پر حکومت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ نتیجتاً ہندوستان پر مسلمانوں کے حق کا دعویٰ کرنے والی جمعیت درج بالا سطروں میں یہ کہنے پر آمادہ نظر آتی ہے کہ "جمعیت علمائے ہند مسلمانوں کے لیے کوئی ناواجب اور غیر منصفانہ رعایتیں نہیں مانگتی۔" اب یہ کہنا مشکل ہے کہ جمعیت اس طرح کا موقف محض مصلحتاً اختیار کر رہی تھی اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ہندوؤں کا تعاون چاہتی تھی اور اصل مقصد کے حصول کے بعد وہ پھر ہندوستان پر مسلم حکومت کے دعویٰ کی طرف پلٹ کر مسلح جدوجہد کے ذریعے مسلمانوں کی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کرنے کا ارادہ رکھتی تھی یا وہ حقیقتاً اس بات پر قائل ہو چکی تھی کہ ہندوؤں کی اکثریت پر حکمرانی اب ممکن نہیں لہٰذا باہم مل

کر رہنے کا ڈھنگ اپنانا ناگزیر ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک بات کی تصدیق کرنا ممکن نہیں ہے۔ جبکہ دوسری طرف یہ حقیقت تھی کہ ہندوؤں کے اکثریت میں ہونے اور مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی حقیقت کا ادراک مسلم قائدین کو مسلم لیگ کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے یوم تاسیس کے دن نواب سلیم الملک کی تقریر کا متن بھی کچھ ایسا ہی تھا جس میں وہ مسلمانوں کو انگریز کے جانے کے بعد ہندو اکثریت کے عفریت سے ڈرا رہے تھے۔

مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوموں سے پانچواں حصہ ہیں اور اس لیے یہ ایک بہت صاف مضمون ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہے تو اُس وقت وہی قوم ملک پر حکمران ہو گی جو تعداد میں ہم سے چار حصے زیادہ ہے اور اب صاحبو! ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اُس وقت ہماری حالت کیا ہو جاوے گی۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہو گی کہ ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو اور ہمارا مذہب سب خطرہ میں ہو گا[15]۔

جمعیت علمائے اسلام کی تشکیل

جیسا کہ اوپر کی سطروں میں بیان کیا گیا کہ جمعیت علمائے اسلام پاکستان میں جمعیت علمائے ہند کی جانشین جماعت ہے۔ پاکستان کے حصول کے سوال پر جمعیت علمائے ہند کے علما میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور اُن کے رفقاء کا موقف قائداعظم کے موقف کی تائید میں اور پاکستان کے قیام کے میں حق میں تھا، لہذا اُنہوں نے جمعیت کے نظریہ یا فلسفہ کے برخلاف مسلم لیگ اور قائداعظم کی مسلم عوام کی خواہشات پر پوری اُترتی فکر و سوچ کو بھرپور انداز میں سپورٹ کیا:

> "قرارداد ِ پاکستان کے پاس ہونے کے بعد علماء کے دو گروہ ہو گئے، ایک گروہ نے قراردادِ پاکستان کی تائید اور حمایت کی اور دوسرے گروہ نے اس کی مخالفت کی۔ پہلے گروہ میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے ہم خیال دیگر علماء شامل تھے۔ جبکہ دوسرے گروہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید حسین احمد مدنی اور اُن کے رفقاء کار شامل تھے[16]۔"

دراصل 1940ء میں مسلم لیگ کی لاہور کی قرارداد کے بعد سے متحدہ قومیت یا دو قومی نظریہ، صوبائی خود مختاری یا علیٰحدہ وطن کے نام پر علماء کرام میں اختلاف نظر آ رہا تھا، تاہم علماء میں پاکستان کے نام پر واضح تفریق ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول کی جانب سے ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ہندوستان کی تقسیم کے سوال پر انتخابات کے اعلان کے بعد دیکھنے میں آئی۔ یہ وہ موقع تھا جب علماء و مشائخ میں سے کچھ شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے کہ اس وقت مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کے لیے اس معاملے پر ہم خیال علماء کی ایک جماعت جمعیت علمائے ہند کی طرز پر بنانا ناگزیر ہو چکا ہے۔ اور خصوصاً مجوزہ انتخابات میں مسلم لیگ کے نمایندوں کو زیادہ سے زیادہ کامیابی دلانے کے لیے بھی علماء کی مدد اور تعاون بہت ضروری تھا جو کہ ایک منظم جماعت کی تشکیل کے بغیر ممکن نہ تھا۔

مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت میں آگے آنے والے علماء کے سر خیل مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔ جبکہ دیگر علماء میں مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا مفتی شفیع دیو بندی، مولانا محمد طاہر قاسمی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری، مولانا آزاد سبحانی اور مولانا غلام مرشد خطیب جامعہ عالمگیری وغیرہ شامل تھے۔ غرض یہ کہ ان بزرگوں کی کوششوں سے کل ہند جمعیت علمائے اسلام کا قیام گیارہ جولائی 1945ء کو کلکتہ میں عمل میں آیا[17]۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کس طرح پاکستان کے حق میں دلائل دے کر علماء اور عام مسلمانوں کو مسلم لیگ کا ساتھ دینے اور اُسے مضبوط کرنے کے لیے قائل کر رہے تھے، درج ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

"اس جمعیت کا قیام علماء وفضلاء کے ایک اہم اجلاس میں ہوا تھا جس کی صدارت علامہ آزاد سبحانی کر رہے تھے۔ اس اہم اجلاس میں مولانا شبیر احمد عثمانی بوجوہ علالت شریک نہیں ہو سکے تھے تاہم اُنہوں نے 29 صفحات پر مشتمل اپنا ایک پیغام ضرور بھیجا تھا جس میں اُنہوں نے شرعی، سیاسی اور عملی دلائل سے مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ علامہ عثمانی نے اپنے حلقہ اثر میں یہ بات ذہن نشین کرائی کہ مسلمانوں کو اسلامی نظامِ حیات جاری وساری کرنے کے لیے اپنی علیٰحدہ تنظیم اور اپنی ایک علیٰحدہ ریاست کا ہونا ضروری ہے[18]۔"

اس اجلاس میں مولانا شبیر احمد عثمانی کو اُن کی عدم شرکت کے باوجود جمعیت کا پہلا امیر چُن لیا گیا تھا۔ بعد ازاں قیام پاکستان کے بعد 1952ء میں پاکستان کے حوالے سے ایک نئی پالیسی کے تحت MJUI یعنی متحدہ جمعیت علمائے اسلام سے الگ ہو کر JUIP جمعیت علمائے اسلام پاکستان قائم کی گئی۔ مولانا احمد علی لاہوری اس جماعت کے پہلے امیر اور مولانا احتشام الحق تھانوی پہلے ناظم مقرر ہوئے۔ 1954ء میں دوبارہ انتخابات میں مولانا مفتی محمد حسن کو امیر منتخب کیا گیا۔ مولانا مفتی محمد حسن کی علالت کے سبب مولانا محمد شفیع قائم مقام امیر کے طور پر کام کرتے رہے۔ 1956ء میں ہونے والے امیر کے انتخاب میں مولانا احمد علی دوبارہ امیر منتخب ہوئے اور ان کے ساتھ مولانا محمد غلام غوث ہزاروی ناظم بنے۔ 1958ء میں جنرل ایوب نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور سیاسی جماعتوں پر سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی تو جمعیت علمائے اسلام بھی اس پابندی کی زد میں آئی اور اس کی سرگرمیاں موقوف ہو گئیں۔ تاہم جمعیت کے علماء نے خود کو بے عملی سے بچانے اور متحرک رکھنے کے لیے (NUP) یعنی 'نظام العلماء پاکستان' تشکیل دی اور دینی و مذہبی سرگرمیوں کو اس کے پلیٹ فارم سے جاری وساری رکھا۔ 23 جون 1959ء کو (NUP) کا کنونشن لاہور میں منعقد ہوا جس میں مولانا احمد علی کو امیر اور مولانا غلام غوث ہزاروی کو ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا[19]۔ جب 1962ء میں سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی اُٹھالی گئی اور سیاسی جماعتوں کی حیثیت بحال کر دی گئی اور جمعیت کی سرگرمیاں بھی بحال ہو گئیں تو اسی کے ساتھ مولانا احمد لاہوری کی جگہ مفتی محمود کو جمعیت کا سربراہ چُن لیا گیا۔ اُس کے بعد جب تک مفتی محمود صاحب زندہ رہے وہی جمعیت کے امیر منتخب ہوتے رہے۔ 1980ء میں اُن کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن بطور امیر جماعت منتخب ہوئے اور تب سے تادم تحریر مولانا فضل الرحمٰن ہی جمعیت کے امیر ہیں۔

جمعیت علمائے اسلام کا نظریہ

مولانا شبیر احمد عثمانی جمعیت علمائے ہند کی ہندوستان کی کامل آزادی کے مقصد کو پانے کے لیے کانگریس کی حمایت میں اس قدر آگے نکل جانے سے سخت نالاں تھے جس کی وجہ سے جمعیت کو کانگریس کی مسلم مخالفت میں بنائی گئی کھلی پالیسیوں کے باوجود بارہا مصلحتاً خاموشی اختیار کرنا پڑ رہی تھی۔ جس کا عملی مظاہرہ کانگریس کی جانب سے پیش کردہ وار دھا اسکیم کے وقت دیکھنے میں آیا جو یقینی طور پر مسلم مفادات کے خلاف تھی، مگر جمعیت کے علماء حیران کن طور پر اس پر خاموشی اختیار کیے رہے۔ جمعیت کی اس خاموشی پر متحدہ جمعیت علمائے اسلام کے علماء کا تبصرہ کچھ یوں تھا۔

کانگریسی جمعیت علماء ہند بلا شرط و بلا معاہدہ کانگریس سے موالات کرنے میں مٹ چکی ہے اور اس کی خاطر ملت اسلامیہ سے بھی کٹ چکی ہے۔ لیکن کانگریس نے جمعیت علماء اور امارت شرعیہ کے اعتراضات واحتجاجات کو پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں دیا۔ حتیٰ کہ مولانا ابُوالکلام آزاد اور ڈاکٹر محمود نے مولانا سجاد کو جواب تک نہ دیا اور وار دھا اسکیم میں ایک شوشا اور نقطہ کی ترامیم بھی نہیں کرا سکے اور کروا بھی کیسے سکتے تھے یہ غریب کانگریس میں کیا اثر و اختیار رکھتے ہیں اور ان کے پیچھے کون سی عوامی طاقت ہے۔ وہ اپنی قوم سے کٹ کر کانگریس میں محض ہندو راج کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ اے کاش وہ اور اُن جیسے بعض دوسرے حضرات اب بھی ملت کی طرف رجوع کریں اور اپنا رشتہ امت سے جوڑیں[20]۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کا جمعیت علمائے ہند سے اختلاف سیاسی نظریات کی بنیاد پر تھا لیکن اگر اس کے دینی و مسلکی فکر و فلسفہ کی بات کی جائے تو جمعیت کی یہ شاخ بھی اپنا رشتہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی علمی، تعلیمی اور اصلاحی تحریک سے اور پھر اسی تناظر میں شاہ ولی اللہ اور اُن کے خانوادے کے فکر و فلسفہ سے جوڑتی ہے۔ جمعیت علمائے ہند سے جمعیت علمائے اسلام کا اختلاف محض ایک نکتہ کے گرد گھومتا تھا اور وہ یہ تھا کہ جمعیت علمائے ہند ہندوستان میں متحدہ قومیت (Composite Nationalism) کا پرچار کرتے ہوئے ایک ایسی کامل آزادی کی خواہاں تھی جس میں ہندو اور مسلمان سیاسی طور پر ایک قوم بن کر ساتھ رہیں۔ اس سلسلے میں مولانا حسین احمد مدنی کی رائے کچھ اس طرح تھی:

> In the modern age, nations are founded on homelands; nations are not founded on the basis of race or religion. The dwellers of England are recognized as one nation, whereas they have Jews and Christians as their citizens, and such is the case with America, Japan and France[21].
>
> "دور جدید میں قومیں نسل یا مذہب نہیں بلکہ وطن کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں۔ انگلستان کے باشندگان کو ایک قوم مانا گیا ہے، یہودی اور عیسائی جس کے شہری ہیں، اور امریکہ، جاپان اور فرانس کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہے۔ "

ایک عالم اور اسلام کے مایہ ناز اسکالر کی جانب سے قوم کی پیش کی گئی درج بالا تعریف تعجب خیز اس لیے نہیں کہی جاسکتی کہ مسلم لیگ کے موقف کے برخلاف دوسری طرف بھی قومیت کی تعریف کا ایک جامع بیانیہ ہندوستانی قومیت کی صورت میں موجود تھا جو ہندوستان کی اکثریت کا پسندیدہ بھی تھا۔ یوں بھی قوم کی تشکیل میں کار فرما عناصر میں وطن یا علاقہ بھی ایک اہم

عنصر ہوتا ہے۔ لیکن جمعیت علمائے اسلام کے نزدیک قومیت کی یہ تعریف ہندوستان کے معاملے میں ایک ناقابل عمل حل اور اسلام کے لیے خطرہ تھی۔ جمعیت علمائے اسلام کی تشکیل کا اہم مقصد علماء کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے تشکیل پانے والے ملک پاکستان میں وہ ایک مثالی اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ سکیں۔ قرائن سے ثابت ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت بشمول قائداعظم پاکستان کے لیے ایسا کوئی منصوبہ نہیں رکھتے تھے۔ اگر اس بات کو درست مان لیا جائے تو پھر دونوں طرف سے تعاون کی وجہ صرف ایک ہی سمجھ میں آتی ہے کہ مسلم لیگ کے سیاسی رہنما اور جمعیت علمائے اسلام کے علماء کرام اس مسئلہ کو پاکستان کے قیام میں رکاوٹ نہیں بنانا چاہتے تھے اور اسے پاکستان کے عظیم مقصد کو پانے کے بعد پر اُٹھا رکھنا چاہتے تھے۔ یہ ایک طرح کا غیر تحریری معاہدہ تھا جو از خود مسلم لیگ اور جمعیت علمائے اسلام کے مابین طے پا گیا تھا۔ لہٰذا قیام پاکستان کے بعد جب پاکستان کے دستور اور طرز حکومت سے متعلق اہم فیصلوں کا وقت آیا تو جمعیت کے علماء نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ لیاقت علی خان کی اسمبلی سے 1949ء میں منظور ہونے والی قرارداد مقاصد بھی علما کی کاوشوں کا نتیجہ تھی اور اس میں ایک بڑا حصہ جمعیت علمائے اسلام کے علماء کا تھا۔ بعد ازاں 1951ء میں کراچی میں سید سلیمان ندوی کی صدارت میں علماء کا ایک اجتماع ہوا جس میں پاکستان میں اسلامی نظام کے لیے بائیس نکات منظور کیے گئے تھے۔ پھر یہی بائیس نکات جمعیت علماء اسلام کی سیاست کا محور بن گئے۔ مولانا مفتی محمود نے 1969ء میں بحیثیت جمعیت کے ناظم عمومی ان ہی بائیس نکات کو راولپنڈی میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں پیش کیا تھا۔

مفتی محمود کی امارت میں جمعیت علمائے اسلام کا پاکستان کی سیاست میں کردار

اگرچہ قیام پاکستان سے 1962ء تک جمعیت نے پاکستان کی انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا تاہم ملک و قوم کے ہر اہم معاملہ میں جمعیت کی شرکت اور دلچسپی دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ آئین سازی کا معاملہ ہو یا پھر قادیانیت کے خلاف اور ختم رسالت کے حق میں چلنے والی تحریکیں تمام معاملات میں جمعیت علمائے اسلام متحرک نظر آتی ہے۔ ریاست پاکستان کے معاملات میں جمعیت کی اس قدر حصہ داری کی وجہ اُس کا وہ استحقاق تھا جو اُسے پاکستان کے مطالبے کی حمایت کرنے اور مسلم لیگ کا ساتھ دینے کے صلے میں حاصل ہوا تھا۔ جمعیت علمائے اسلام کے متحرک کردار کا اندازہ اس ایک مثال سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب پاکستان کے ابتدائی دنوں میں آئین سازی کے حوالے سے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کی جانب سے قائم کردہ بنیادی اُصولوں کی کمیٹی (بی پی سی) نے ایک بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ قائم کیا، جس کا سربراہ سید سلمان ندوی کو بنایا گیا اور اس بورڈ نے آئین سازی میں اسلام کے حوالے سے معاونت کے لیے 21 جنوری 1951ء کو کراچی میں علماء کا ایک کنونشن منعقد کیا تو اس کنونشن میں شامل کل تیس علماء میں سے اُنیس کا تعلق جمعیت علمائے اسلام سے تھا۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کی ابتدا ہی سے آئین سازی میں اسلام کے حوالے سے ہونے والی تمام تر پیش رفتوں میں جمعیت کا کردار سب سے اہم رہا[22]۔

1962ء میں جنرل ایوب کے مارشل لاء کے دوران ہی مولانا احمد لاہوری کی موت کے سبب مفتی محمود کو جمعیت کا امیر مقرر کر دیا گیا تھا۔ یہ وہی سال تھا جب مفتی محمود نے بلدیاتی نظام کے تحت ایوب کی قومی اسمبلی کے لیے الیکشن لڑا۔ اُن کی انتخابات میں جیت سے اس جماعت میں ایک نئی جان پڑ گئی اور اس کی انتخابی سیاست و کردار کا آغاز ہوا۔ مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی وہ شخصیتیں تھے جنہوں نے اس جماعت میں ایک نئی روح پھونک دی اور اسے سیاسی آہنگ عطا کیا اور رفتہ رفتہ یہ ایک ایسی طاقتور سیاسی قوت بنا دیا جس نے ساٹھ کی دہائی سے اب تک پاکستان کی سیاست میں بطور دینی سیاسی جماعت اہم ترین کردار ادا کیا۔

اگرچہ مفتی محمود ایوب کی اسمبلی کا حصہ تھے لیکن اُن کی جماعت نے کئی معاملات میں ایوب کی پالیسیوں کی مخالفت کی جن میں ون یونٹ اسکیم، ماڈرنائزیشن اور فیملی قوانین شامل تھے۔ لہٰذا اس اختلاف کے نتیجے میں ایسا وقت بھی آیا کہ ایوب حکومت نے مفتی محمود کو گرفتار کیا اور وہ ایک سال جیل میں رہے۔ 1968ء میں جمعیت علمائے اسلام نے لاہور میں موچی گیٹ کے مقام پر 3، 4 اور 5 مئی کو ایک کانفرنس منعقد کی جس میں جمعیت کا دستور منظور ہوا اور جماعت کے داخلی انتخابات ہوئے۔ جس میں مفتی محمود کو ایک بار پھر جماعت کا امیر منتخب کر لیا گیا۔ مفتی محمود نے وفاق المدارس پاکستان کے قیام میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اُنہیں وفاق المدارس کا پہلا صدر بھی منتخب کیا گیا۔ 1970ء کے انتخابات میں جمعیت علمائے اسلام سمیت 18 دینی جماعتوں نے 'متحدہ دینی محاذ' کے نام سے ایک اتحاد تشکیل دیا اور مفتی محمود کو اس کا صدر بنایا گیا۔ جمعیت علمائے اسلام نے متحدہ دینی محاذ کے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیا اور مغربی پاکستان سے قومی اسمبلی کے لیے سات نشستیں جیتنے میں کامیاب ہوئی۔ اس انتخاب نے خود جمعیت کے اندر اور اسی طرح سے پورے ملک میں مفتی محمود کے سیاسی مقام اور حیثیت کو بہت بلند کر دیا تھا کیونکہ اُنہوں نے انتخابات میں ڈیرہ اسماعیل خان کے اپنے حلقہ سے ذوالفقار علی بھٹو کو بھاری اکثریت سے شکست دے کر زبردست کامیابی حاصل کی تھی[23]۔

یکم مارچ 1972ء کو خیبر پختونخوا میں پاکستان پیپلز پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کے درمیان ہونے والے ایک معاہدہ کے نتیجے میں مفتی محمود نے بطور وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا کے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ لیکن محض ساڑھے دس ماہ بعد 14 فروری 1973ء کو اُس وقت اپنی کابینہ سمیت وزارت اعلیٰ کے منصب سے مستعفی ہو گئے جب ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت کی مخلوط حکومت کو ایک انتظامی حکم کے ذریعے برطرف کر دیا[24]۔ بعد ازاں 1976ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے مقابلے کے لیے نو جماعتوں کا ایک بڑا اتحاد 'پاکستان قومی اتحاد' کے نام سے تشکیل پایا تو مفتی محمود کی جماعت اس اتحاد کا حصہ تھی اور مفتی محمود اس اتحاد کے صدر منتخب کیے گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ جب انتخابات کے بعد قومی اتحاد کی جماعتوں نے بھٹو پر دھاندلی کا الزام لگا کر نتائج کو نہ ماننے اور دوبارہ انتخابات کرانے کے لئے تحریک چلائی تو اُس احتجاجی تحریک میں بھی جمعیت علمائے اسلام اتحاد کے ساتھ تھی۔ یہ وہی احتجاجی تحریک تھی جو

بھٹو حکومت کے خاتمہ، بھٹو کی پھانسی اور ملک میں مارشل لاء کے نفاذ پر منتج ہوئی۔ جنرل ضیاء کے ابتدائی دور میں، 1979ء میں جب افغانستان میں روسی مداخلت کے سبب مسلح مزاحمت کا آغاز ہوا اور جنرل ضیاء کی حکومت نے امریکہ کے تعاون سے اس جنگ میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو مفتی محمود اور اُن کی جماعت نے اسے جہاد قرار دیتے ہوئے اُصولی طور پر اس میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس جماعت کو زبردست ریاستی حمایت اور سہولیات میسر آئیں۔ اسے لاتعداد نئے مدرسے قائم کرنے کا موقع ملا اور اس کے لیے بھرپور بیرونی امداد کے راستے بھی کھُلے۔ ان مدرسوں میں بے شمار پاکستانی اور افغان نوجوانوں کو جہاد کی تعلیم دی گئی اور اُنہیں افغان جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار کیا گیا۔ تاہم ابھی یہ جنگ اپنے ابتدائی مرحلے ہی میں تھی کہ 14 اکتوبر 1980ء کو مفتی محمود صاحب کا رضائے الٰہی سے انتقال ہو گیا۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند مولانا فضل الرحمٰن کو جمعیت کا امیر منتخب کر لیا گیا اُس وقت اُن کی عمر محض 27 برس تھی۔

حواشی و حوالہ جات

1 www.ecp.pk.com

2 شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر: 280، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، 2001ء

Shiekh Mohammad Ikram, Rodi Kausar, Idara e Saqafati Islamia, Lahore, 2001, Page: 280

3 مولانا سید محمد میاں، تحریک شیخ الہند: 51، لاہور: 1991ء

Molana Said Muhammad Mian, Tahrik Shiekul Hind, Lahore, 1991, Page: 51

4 رودِ کوثر: 600

Rodi Kausar, Page: 600

5 ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری، ہند پاکستان کی تحریک آزادی اور علمائے حق کا سیاسی موقف: 221، جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور، جنوری 2007ء

Dr. Abu Salman Shah Jehan Pori, Hind Pakistan ki Tahriki Azada aur Ulamaie Haq ka Siyasi Moqaf, Jamiat Publications, Lahore, January 2007, Page: 221

6 تحریک شیخ الہند: 223

Tahrik Shiekul Hind, Page: 223

7 مولانا عبدالرحمان، تحریک ریشمی رومال: 47، کلاسک پبلشرز، لاہور، 1988ء

Molana Abdul Rahman, Tahrik Reeshmi Romal, Classic Publishers, Lahore, 1988, Page: 47

8 نفس مصدر 159 - 169

Ibid, Page: 159-169

9 تحریک ریشمی رومال: 247

Tahrik Reeshmi Romal, Page: 247

10 مولانا سید محمد میاں، جمعیت علما کیا ہے؟: 11-12، شعبہ نشر و اشاعت جمعیت علمائے اسلام پاکستان، لاہور، 1990ء

Molana Said Muhammad Mian, Jamiat kia Hy, Nashr w Isha'at Jamiat Ulamaie Islam Paksitan, Lahore, 1990, Page: 11-12

11 نفس مصدر:13

Ibid, Page: 13

12 جمعیت کیا ہے؟:214

Jamiat kia Hy, Page: 214

13 نفس مصدر 215-216

Ibid, Page: 215-216

14 جمعیت کیا ہے؟255 –256

Jamiat kia Hy, Page: 255-256

15 پروفیسر محمد عثمان، مسعود اشعر، پاکستان کی سیاسی جماعتیں:34، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1988ء

Prof. Muhammad Usman & Masood Asha'r, Paksitan ki Siyasi Jama'tian, Sung Mail Publications, Lahore, 1988, Page: 34

16 ڈاکٹر ایچ-بی خان، تحریک پاکستان میں علماء کا سیاسی و علمی کردار:7، الحمد اکیڈمی، کراچی، 1995ء

Dr. H-B Khan, Tahrik Paksitan may Ulama' ka Sisyasi wa Ilmi Kirdar, Al-Hamd Academy, Karachi, 1995, Page: 7

17 نفس مصدر:65

Ibid, Page: 65

18 تحریک پاکستان میں علماء کا سیاسی و علمی کردار:65-66

Tahrik Paksitan may Ulama' ka Sisyasi wa Ilmi Kirdar, Page: 65-66

19 Sayyid A.S. Pirzada, The Politics of the Jamiat Ulema-i-Islam Pakistan 1971-1977, Karachi, 2000), Page: 2-4

20 جمعیت علماء کیا ہے؟:70-71

21 The Politics of the Jamiat Ulema-i-Islam Pakistan 1971-1977, Page: 4

22 Ibid, Page: 18

23 www.na.gov.pk/uploads/former-embers/5th%20National%20Assembly

24 www.khyber.org/people/a/Mufti_Mehmood.shtml